تقسیم اور فسادات کے بعد اردو افسانے کی فضا

تقسیمِ ہند اور فسادات کے دوران قتل و غارت گری، لوٹ مار اور خواتین کی بے حرمتی کے جو واقعات پیش آئے اسے بہ کثرت افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ تقسیم، فسادات اور ہجرت کے بعد بھی مسائل ختم نہ ہوئے لوگوں کو نئے ملک اور نئے لوگوں سے اجنبیت کا احساس ہوا۔ ان حالات میں یادیں ان کا سہارا بنیں۔ آزاد ملک میں آنے کے بعد بیش تر لوگ۔۔۔ صبح و شام اپنے بچھڑے ہوؤں کو تلاش کرنے اور انھیں یاد کرنے میں گزارتے۔

تقسیم اور فسادات کے بعد کی صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے سب سے زیادہ افسانے تخلیق کیے۔ قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے بیشتر افسانوں کا موضوع ماضی پرستی ہے۔ ماضی پرستی کے حوالے سے تقریباً تمام افسانوں میں دوستوں تعلیمی اداروں، پرانے استادوں یا محلے والوں کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کی یاد کو بیان کیا گیا ہے۔

تقسیم کے بعد انھوں نے جو بھی افسانے لکھے ان میں قتل و غارت گری، لوٹ مار یا خواتین کے بے آبروئی کے بجائے مہاجرین کی نفسیاتی الجھنوں مثلاً نئے ملک میں اجنبیت کے احساس، ماضی کی یادیں اور تقسیم کے بعد لوگوں کی معاشرتی اور معاشی حیثیت میں آنے والے فرق کو بہت فن کاری سے پیش کیا ہے۔

قرۃ العین کے افسانوں کے مجموعے ''یادکی اِک دھنک جلے''، ''پت جھڑ کی آواز'' اور ''شیشے کے گھر'' کے بیش تر افسانے تقسیمِ ہند کے بعد مہاجرین کی جذباتی کیفیات سے متعلق ہیں۔ خاص طور پر ''حسب نسب''، ''جلاوطن'' اور ''پت جھڑ کی آواز'' اپنے موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بہترین افسانوں میں سے ہیں۔

انتظار حسین نے مہاجرین کی نفسیاتی الجھنوں اور نئے ملک میں آبادکاری کے سلسلے میں پیش آنے والے مسائل کو اپنے افسانوں کے مجموعے ''شہرافسوس'' اور ''گلی کوچے'' میں بیان کیا ہے ان افسانوں کے مجموعوں میں ''استاد''، ''قیوما کی دکان''، ''ایک بن لکھی رزمیہ'' وغیرہ کو شہرت حاصل ہوئی۔

موجودہ دور کے افسانہ نگاروں میں سید محمد اشرف کا افسانہ ''ڈار سے بچھڑے'' میں ہجرت کر کے آنے والوں کی مجبوریوں کو بیان کیا گیا ہے۔ افسانے کے کردار واحد متکلم، نواب، غلام علی اور وزیر الدین کی

بیویاں اور اپنے آبائی وطن جانے کے لیے بے چین ہیں لیکن معاشی مسائل اور شوہر کی اجازت کے بغیر ان کے لیے یہ شوق پورا کرنا ممکن نہیں، اس طرح نواب اپنی کاروباری مصروفیات کی وجہ سے اور واحد متکلم سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے ہندوستان نہیں جاسکتا۔

مسعود اشعر کا افسانہ ''اپنا گھر'' موجودہ حالات کی محکاسی کرتا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کو ایک دوسرے کے بارے میں جو غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہیں۔ مذکورہ افسانے میں ''احمد'' کے کردار کے ذریعے انھیں بھی بیان کیا گیا ہے۔

پت جھڑ کی آواز:

قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ ان کے مشہور افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس کا موضوع ماضی پرستی ہے۔ افسانے کو قرۃ العین نے تنویر فاطمہ کی آپ بیتی کی شکل میں لکھا ہے۔ تنویر فاطمہ، خوش ونت سنگھ، فاروق اور وقار حسین افسانے کے اہم کردار ہیں۔

افسانے کی کردار تنویر فاطمہ کا تعلق میرٹھ کے ایک مذہبی اور زمیں دار گھرانے سے تھا لیکن تنویر فاطمہ جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں پہلے علی گڑھ اور پھر دلی گئی تو اسے ہوسٹل میں رہنا پڑا، یونیورسٹی اور ہوسٹل کی آزاد فضا کا اس نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اسی دوران تنویر فاطمہ کی دوستی میجر خوش ونت سنگھ سے ہوگئی۔ خوش ونت سنگھ کے ساتھ وہ سیر وتفریح کے لیے دوسرے شہروں میں بھی جانے لگی اور تعلیم سے اس کی دل چسپی کم ہوتی چلی گئی۔ تنویر فاطمہ کی ان حرکتوں کی وجہ سے یونیورسٹی کی لڑکیاں اسے سخت ناپسند کرتی تھیں۔ اگرچہ خوش ونت سنگھ اور تنویر فاطمہ دوستی میں بہت آگے جاچکے تھے۔ خوش ونت سنگھ کی عیسائی لڑکی سے منگنی بھی ہوچکی تھی۔ تنویر فاطمہ کو جب اس حقیقت کا علم ہوا تو اسے عیسائی لڑکی سے سخت نفرت محسوس ہوئی۔ لیکن جب خوش ونت سنگھ نے تنویر فاطمہ سے شادی کرنا چاہی تو تنویر فاطمہ نے انکار کردیا۔ انکار کرنے پر خوش ونت نے تنویر سے کہا:

> ''میں نے کیا ہندو مسلم شادیوں کا حشر نہیں دیکھا۔ کئیوں نے ترقی پسندی یا جذبۂ عشق کے جوش میں آکر ہندوؤں سے بیاہ رچائے اور سال بھر کے اندر جوتیوں میں دال بٹی۔ بچوں کا جو حشر خراب ہوا وہ الگ۔ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے''[۱]

تنویر فاطمہ کے انکار کے بعد خوش ونت سنگھ نے عیسائی لڑکی سے شادی کرلی۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد خوش ونت نے پھر سے تنویر فاطمہ سے ملنا جلنا شروع کردیا ملاقاتوں کا یہ سلسلہ تقریباً ایک سال تک جاری رہا۔ اس کے بعد خوش ونت سنگھ نے اپنے دوست فاروق سے تنویر فاطمہ کا تعارف کروادیا۔ فاروق کا شمار ہندوستان کے بڑے تاجروں میں ہوتا تھا۔ بہت جلد فاروق اور تنویر فاطمہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ اس کے بعد خوش ونت سنگھ اور تنویر فاطمہ کا رابطہ نہ رہا۔

اب تنویر فاطمہ فاروق کی منگیتر کی حیثیت سے ہر جگہ آنے جانے لگی۔ فاروق شادی شدہ بال بچوں والا چالیس سالہ مرد تھا۔ لیکن تنویر فاطمہ کو اس بات پر کوئی اعتراض نہ تھا۔

ان ہی دنوں تقسیم ہند کا اعلان ہو گیا۔ ملک کے حالات بہت زیادہ خراب ہو گئے خاص طور پر مسلم لڑکیوں کے لیے یہ وقت بہت سخت اور تکلیف دہ تھا۔ ہر لڑکی کی عزت خطرے میں تھی۔ تنویر فاطمہ کے والد نے اسے پاکستان بھیج دیا۔ فاروق بھی یہی چاہتا تھا کہ تنویر فاطمہ پاکستان چلی جائے فاروق نے تنویر فاطمہ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پاکستان جا کر اس سے شادی کرے گا۔ تنویر فاطمہ کے پاکستان جانے کے بعد فاروق دلی سے ہر تین ماہ بعد لاہور میں اس سے ملنے جاتا اور اسے اس کی ضرورت کے مطابق پیسے بھی دیتا رہا، لیکن نئے ملک میں تنویر فاطمہ کو اجنبیت کا احساس بہت شدت سے ہوا۔ ہجرت کے کرب اور پرانی یادوں نے اسے بہت بے چین رکھا۔ تنویر فاطمہ کی اس کیفیت کو قرۃ العین نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ''میں زندگی کی اس یک بیک تبدیلی سے اتنی ہکا بکا تھی کہ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا کہاں غیر منقسم ہندوستان کی وہ بھرپور دل چسپ رنگا رنگ دنیا، کہاں ۱۹۴۸ء کے لاہور کا وہ تنگ و تاریک مکان! غریب الوطنی، اللہ اکبر! میں نے کیسے کیسے دل ہلانے والے زمانے دیکھے ہیں''۔[۲]

ان دنوں پاکستان میں لیکچررروں کی بہت ضرورت تھی۔ تنویر فاطمہ نے شدید اکتاہٹ اور بیزاری کے باوجود ایک کالج میں پڑھانا شروع کر دیا۔

فاروق اور تنویر کی ایک دوسرے سے دل چسپی کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی۔ فاروق نے تنویر فاطمہ کو لاہور میں اپنے دوست وقار سے ملوایا۔ تنویر فاطمہ کی وقار سے دوستی اس حد تک بڑھی کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر تنویر فاطمہ سے شادی کر لی۔

وقار سے شادی کرنے کے بعد اس کی زندگی میں بظاہر کسی قسم کی تکلیف نہ تھی۔ اور اسے ہر قسم کی مادی آسائش بھی میسر تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ماضی سے نہ نکل سکی نہ ہی خوش ونت سنگھ کی یادوں کو فراموش کر سکی۔

خوش ونت سنگھ جو اس کی پہلی محبت تھا۔ اس سے شدید محبت رکھنے کے باوجود وہ اس سے شادی نہیں کر سکتی تھی۔ کیوں کہ شدید محبت کے باوجود دونوں کے درمیان مذہبی تفریق بھی تھی۔ تنویر فاطمہ خوش ونت سنگھ کو بھول جانا چاہتی تھی لیکن اس کے لاشعور میں وہ بری طرح چھایا ہوا تھا۔

اس افسانے کے یوں تو کئی پہلو ہیں لیکن جو چیز نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے وہ تنویر فاطمہ کا ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد زندگی میں پیدا ہونے والا خلا ہے۔ دلی اور علی گڑھ جہاں اس نے اپنی تعلیم

مکمل کی اور زندگی کے بہترین دن گزارے ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں کی جدائی اور ان کی یادوں نے اس کی زندگی اور شخصیت پر گہرے اثرات ڈالے یہاں تک کہ زندگی کی تمام دل چسپیاں اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گئیں۔

افسانے کا سارا تانا بانا خود قرۃ العین کی ذات اور شخصیت کی آئینہ داری کرتا ہے۔ ہندو مسلم کلچر کا معاشقانہ ملاپ اس میں ناکامی، پاکستان آنا اور یہاں کے ماحول کا راس نہ آنا اور شادی کے بعد بھی ماضی کی یادوں کے باعث آسودگی حاصل نہ ہونا یہ سارے عناصر قرۃ العین کے پسندیدہ موضوعات ہیں اور ان کی ذات کی ماضی پرستی اور ناسٹلجیا ظاہر کرتے ہیں۔

جلاوطن:

قرۃ العین حیدر کا یہ افسانہ بھی ان کی ماضی پرستی کا عکاس ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے تقسیم ہند سے پہلے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی تصویر کشی کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کھیم دلی، کشوری، پروفیسر آفتاب، کنول کماری، اصغر عباس، رما کانت کی باہمی دوستی کو بیان کیا ہے جو تقسیم ہند کے بعد نفرت میں بدل گئی اور محبت اور گرم جوشی کی جگہ سرد مہری اور اجنبیت نے لے لی۔ خورشید زہرہ عابدی نے اس افسانے کے بارے میں یہ رائے دی ہے کہ:

> "اس افسانے میں جلاوطنی اور ہجرتوں کا احوال ہے انسانی رشتوں کے ٹوٹ جانے کا غم ہے جدید عہد کی زندگی کے اس اختراق اور انتشار کا اظہار ہے جہاں زندگی، موت، شخصیت اور وجود سب اپنے اپنے تضادات سے متصادم ہیں ان کرداروں کی داستان ہے جو کبھی اپنی دنیا میں اپنی تہذیب اور تاریخ کا محور تھے۔ ہجرت سے پیدا ہونے والا زندگی کا خلاء جو ذاتی شخصی اور بڑا شدید ہے اور اس نسل کا ترجمان بھی جسے ایک تہذیب، ایک ثقافت اور ایک آشنا ملک سے کٹ جانے کا ملال ہے"۔[۳]

کھیم اور کشوری بچپن کی سہیلیاں تھیں۔ کشوری کا بھائی اصغر عباس اور کھیم کا بھائی رما کانت بھی آپس میں ایک دوسرے کے دوست تھے۔

کشوری اور کھیم دونوں کے خاندانوں سے آفتاب رائے کے دوستانہ مراسم تھے۔ آفتاب رائے کے مشورے پر ہی کشوری اور کھیم دونوں میٹرک کے بعد لکھنو پڑھنے کے لیے گئی تھیں۔

کھیم اور کشوری نے لکھنو جا کر ایک دوسرے سے رابطہ رکھنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ان ہی دنوں ملک کے سیاسی حالات بگڑ گئے۔ ہندو اور مسلمان لیڈروں کے علاوہ عام لوگ بھی خود کو ایک دوسرے سے مذہبی اور تہذیبی لحاظ سے مختلف محسوس کرنے لگے بہت سے ہندو اور مسلم گھرانوں کی طرح کشوری اور کھیم کے گھر والوں کے درمیان بھی فاصلے پیدا ہو گئے۔

کشوری جو کانگریس کی حمایتی تھی اب اس نے مسلم اسٹوڈینٹس فیڈریشن میں اور کھیم دتی نے ہندمہا سبھا میں شمولیت اختیار کر لی۔ یوم پاکستان کے موقع پر کھیم اور اس کے ساتھیوں نے کشوری سمیت مسلم لیگ کے طلبہ پر اینٹیں پھینکیں۔

''طالب علموں کی دنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست کل کی تشویش۔ مستقبل کی فکر ملک کی تقسیم ہوگی، نہیں ہوگی، ہوگی۔''[۴]

کھیم اور کشوری ایک یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے ملنے سے کترانے لگیں، اور لکھنو میں آنے کے چار سال بعد بھی کشوری اور کھیم کا آمنا سامنا ہوا تو کھیم کشوری کو ہیلو کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکی۔ طالب علموں کے علاوہ ہندو پروفیسر بھی مسلمان طالب علموں کو ناپسند کرنے لگے۔

''مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو یوں ہی پاس کر دیا جاتا۔ جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کے وقت ہندو اکثریت والے ہوٹلوں میں لاؤڈ اسپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔''[۵]

آخرِ کار ملک تقسیم ہو گیا۔ کئی مسلمانوں نے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی۔ کشوری اپنے والد کے ساتھ ہندوستان ہی میں رہی۔ جب کہ اس کا بھائی جوانڈین فوج میں تھا ہجرت کر کے پاکستانی فوج میں چلا گیا۔ وہ پاکستان سے انھیں نہ تو خط لکھ سکتا تھا اور نہ ہی روپے پیسے بھیج سکتا تھا، کشوری کے گھر کے مالی حالات اس حد تک خراب ہوئے کہ نوبت گھر کے برتن اور استعمال کی چیزیں بیچنے تک آ گئی۔ ان حالات میں کشوری نے ملازمت کرنے کی کوشش کی تو مسلمان ہونے کی وجہ سے اسے ہر جگہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

جب کشوری کو ہندوستان میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہ رہی تو مجبوراً اس نے اپنے بوڑھے باپ کو تنہا چھوڑا اور وظیفہ لے کر انگلستان چلی گئی۔ کشوری کے جانے کے بعد اس کے والد کا انتقال ہو گیا۔

انگلستان میں ایک دن کشوری نے کھیم کو اس کے شوہر کے ساتھ دیکھا تو اس کے بچپن کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ اس نے سارے مذہبی اور سیاسی اختلافات اور ذاتی تلخیوں کو بھلا کر اسے نمستے کہا لیکن کھیم کا دل محبت اور انسیت کے جذبات سے بالکل بے نیاز تھا۔ اس نے بہت روکھے اور طنزیہ انداز میں کہا:

''تم تو پاکستانی ہو، تمھیں نمستے نہ کہنا چاہیے تھا۔''[۶]

کشوری کا دل پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا۔ کھیم کے اس رویے سے اسے ایک اور دھچکا لگا اور اسے ماضی وہ سنہرا دور لگا جس میں ہندو اور مسلمان تمام اختلافات کے باوجود مل کر رہتے تھے۔ ان کی مشترکہ ہندوستانی تہذیب تھی۔ جسے بننے میں صدیاں لگیں تھیں۔ لیکن جب کشوری کا اور اس کے ساتھیوں کا دور شروع ہوا تو یہ تہذیب ایسی بکھری کہ اسے سمیٹنے کی امید تک نہ رہی۔

ماضی کی قدر و قیمت اور اچھے دنوں کا یہ احساس قرۃ العین حیدر کے اپنے ناسٹلجیا کی دین ہے وہ خود ماضی کے سہانے خوابوں میں رہنے کی عادی ہیں اور اپنے قاری کو بھی ماضی کے انھیں خواب ناک لمحوں میں لے جانا چاہتی ہیں۔

حسب نسب:

''حسب نسب'' قرۃ العین حیدر کے مشہور افسانوں میں سے ایک ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے چھمی بیگم کے کردار کے ذریعے انسان کی زندگی میں آنے والے مختلف نشیب و فراز کو بیان کیا ہے۔

شہاہ جہاں پور کی چھمی بیگم کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ اس کے گھر کے دو حصے تھے۔ زنانہ حصہ ''املی والا گھر'' اور مردانہ حصہ ''چنبیلی والا گھر'' کہلاتا تھا۔ املی والے گھر میں چھمی بیگم، اس کی والدہ اور تائی اور چنبیلی والے گھر میں چھمی کے والد، تایا اور اجو رہتے تھے۔

چھمی کی منگنی بچپن ہی میں اپنے تایا کے بیٹے ''اجو'' سے ہو چکی تھی جب چھمی بیگم سولہ سال کی ہوئی تو پہلے اس کی والدہ اور پھر والد کا انتقال ہو گیا، اور کچھ ہی عرصے کے بعد اس کے تایا کا بھی انتقال ہو گیا۔ باپ کے انتقال کے بعد اجو لکھنو چلا گیا اور پھر وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد اس نے ایک طوائف سے شادی کر لی اور اسے شاہ جہاں پور لے آیا۔

چھمی جو والدین اور تایا کی موت کے بعد اجو کے بدلے ہوئے رویے سے دکھی ہو گئی تھی اجو کی شادی کے بعد تو اس کی ساری امیدیں ہی خاک میں مل گئیں۔

اجو اور اس کی بیوی کلو بیگم نے چھمی سے دوستی کرنی چاہی لیکن انھیں ہر بار مایوسی کا سامنا کرنا پڑا، خوددار چھمی نے جسے ایک عرصے سے اجو ہر ماہ دو سو روپے بھیجتا تھا اب اس سے پیسے لینے بھی چھوڑ دیئے۔ اس کے بعد چھمی نے پہلے گھر کا قیمتی سامان اور پھر گھریلو سامان بیچ کر گھر کا گزارہ کیا۔ سامان ختم ہونے کے بعد چھمی نے محلے والیوں کے کپڑے سینا اور گھر میں چھوٹا سا مکتب کھول کر بچیوں کو پڑھانا شروع کر دیا اور یوں اس کی گزر اوقات کا بندوبست ہو گیا اور چنبیلی والے مکان سے جہاں اب اجو اور کلو بیگم رہتے تھے۔ چھمی کا تعلق بالکل ختم ہو گیا۔ اسی عرصے میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے اور مسلمانوں کو ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنا پڑی۔

> ''آدھا شاہ جہاں پور سمجھو خالی ہو گیا۔ ان کے مکتب کی ساری لڑکیاں اپنے ماں باپ کے ساتھ پاکستان چلی گئیں۔ چھمی بیگم کے ہاں روٹیوں کے لالے پڑ گئے''۔ ۷

فسادات کے دوران اجو بھائی دہلی میں مارے گئے۔ اجو بھائی کے چالیسویں کے بعد کلو بیگم گھر چھوڑ کر چلی گئیں اور کچھ دنوں کے بعد کلو بیگم کی لڑکی آئی اور چنبیلی والے گھر کا سارا سامان لے کر چلی گئی۔ چنبیلی

والے گھر میں کسٹوڈین کا تالا پڑ گیا۔

چنبیلی والے گھر میں ایک سکھ شرنارتھی ڈاکٹر اپنے گھر والوں کے ساتھ آ کر بس گیا۔ چھمی ملن خان اور دھو خان کے مرنے اور سلامت بوا کے فالج گرنے کے بعد ''املی والے گھر'' میں بالکل تنہا رہ گئی اب وہ چنبیلی والے گھر کی سردارنیوں سے کبھی کبھی اپنے دکھ سکھ کی باتیں کر لیتی۔ چنبیلی والے گھر کی سردارنی کی سفارش پر چھمی نے دہلی میں صبیح الدین کے بچوں کو چالیس روپے ماہوار کی تنخواہ پر قرآن اور اردو پڑھانا شروع کر دیا۔ صبیح الدین کے ریٹائر ہونے کے بعد چھمی کو راشد علی کے گھر ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد راشد علی کا واشنگٹن سفارت خانے میں تبادلہ ہو گیا اور چھمی کی ملازمت کا بندوبست بمبئی میں رضیہ بانو کے گھر ہو گیا۔ رضیہ نے بھی چھمی کو بہت عزت دی یہاں بھی چھمی کا کام نماز اور قرآن پڑھ کر رضیہ بانو کے لیے دعا کرنا تھا۔ بے خبر اور سادہ چھمی کو اس بات کی خبر ہی نہ تھی کہ اب وہ ایک طوائف کے گھر میں ہے۔

> "چھمی بیگم نے اپنی کوٹھڑی میں جا کر ایک بار پھر جائے نماز نکالی۔۔۔ اور اس پروردگار کا شکریہ ادا کیا جس (کذا) نے ان کے باپ دادا کی لاج، ان کے حسب نسب کی عزت رکھ لی اور ایک بار پھر ایک شریف گھرانے کی حق حلال کی کمائی میں ان کا حصہ بھی لگا دیا"۔[۸]

حسب نسب کی چھمی ان مظلوم مسلمانوں کی ترجمان ہے۔ جن کی فسادات کے نتیجے میں معاشی اور سماجی حیثیت بالکل بدل گئی۔ اعلیٰ حسب نسب اور نازک مزاج چھمی کی زندگی میں جیسے جیسے حادثات پیش آتے گئے اس کی حیثیت بھی بدلتی چلی گئی اور حیثیت بدلنے کے ساتھ اس کے مزاج میں صبر و تحمل آتا گیا۔

استاد:

انتظار حسین کے اس افسانے کا موضوع بھی ان کے بیش تر افسانوں کی طرح ماضی پرستی ہے۔ جس میں ماضی کی یادوں کا ماتم کیا گیا ہے۔

افسانے کا بنیادی کردار ''استاد'' ایک مثالی استاد ہے۔ استاد اگرچہ مسلمان تھا لیکن اس کے باوجود ہندو بھی اس سے پیار کرتے اور ہر کام استاد کے مشورے سے کرتے۔ استاد کی حویلی میں لوگ ہر موضوع پر تبادلہ خیال کرتے، لیکن جب ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے استاد کی حویلی بھی پہلے جیسی نہ رہی۔ استاد کا سارا محلّہ خالی ہو گیا۔ مسلمان ہندوستان سے پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور ہندوؤں نے بھی مذہبی تعصب کی وجہ سے استاد کی حویلی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔

> "چاروں طرف خون خرابہ ہوتا رہا۔ آگیں لگتی رہتیں مگر بڑی حویلی کی طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ خیر یہ فساد تو ختم ہو گیا لیکن قیامتیں تو اس کے بعد بھی آئیں اور ایسی آئیں کہ بڑی حویلی کی

بنیادیں ہل گئیں، ہاں نہ ہلے تو استاد اپنی جگہ سے نہ ہلے... زمانہ دیکھتے دیکھتے بدلنے لگا۔ محلے خالی ہونے لگے۔ بھری بستیاں اجڑنے لگیں، لوگ ایمان بچانے کے بہانے جانیں بچا بچا کر گئے۔ استاد نے اسی چبوترے پر بیٹھ کر بلائیں بھی ہوتے دیکھیں اور میلے بھی ڈھلتے دیکھے۔ مگر ان کی وضع داری میں فرق نہ آیا۔ ان کی نگاہیں سڑک پر تو نہیں ہوتی تھیں۔ بس خلا میں جمی رہتی تھیں..... اب ان کی خاموشی بڑھ گئی تھی۔ یہ خاموشی اور بڑھی اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے"۔[9]

افسانے کے کردار استاد کا نہ تو جانی نقصان ہوا اور نہ ہی مالی۔ وہ اس حویلی میں تھا جہاں وہ تقسیم ہند سے قبل رہتا تھا، لیکن اب اس کے پاس رونق بخشنے والے اور محبت کرنے والے نہ رہے۔ یہی استاد کا دکھ تھا جس نے اس کی شخصیت پر گہرے اثرات ڈالے۔ ہر وقت ہنسی مذاق اور شور و ہنگامہ کرنے والے استاد کو چپ لگ گئی اور اس روحانی صدمے نے اس کی جان لے لی۔

اس افسانے میں انتظار حسین نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے۔ انسان صرف روپے پیسے اور جائیداد کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے پیار و محبت کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ وہ صرف پیٹ کی بھوک ہی نہیں مٹانا چاہتا بلکہ اپنے اردگرد اپنے دوستوں اور پیار کرنے والے ساتھیوں کو بھی دیکھنا چاہتا ہے۔ تقسیم ہند کا ایک بڑا نقصان ساتھیوں اور محبتوں سے بچھڑ جانا بھی ہے۔ جس کی وجہ سے تنہائی کا ایسا سمندر وجود میں آ گیا جس کے کنارے نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ متاثر زدہ انسانوں کی شخصیت تباہ و برباد ہو گئی اور بیچ منجدھار میں ہی دم توڑ کر ہمیشہ کے لیے ایسے فنا ہوئے کہ نام و نشاں تک مٹ گئے صرف ان کے افسانے باقی رہ گئے۔

قیوما کی دکان:

انتظار حسین نے یہ افسانہ ماضی کی یادوں میں گم ہو کر لکھا ہے۔ ماضی کو یاد کرتے ہوئے وہ قیوما کی دکان پر آ کر رک گئے ہیں اور پھر قیوما کی دکان کی ایک ایک بات کو اس افسانے میں بیان کر رہے ہیں۔

واحد متکلم، قیوم، کمر جی، الطاف اور بدھن وغیرہ اس افسانے کے اہم کردار ہیں جو ہر وقت قیوما کی دکان پر دیر تک بیٹھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

قیوما کی دکان واحد متکلم کے قصبے کی ایسی دکان ہے جو دن رات کھلی رہتی ہے اور محلے کے لوگوں کے علاوہ آس پاس کے محلے کے لوگ اور دکاندار صرف دودھ دہی یا مٹھائی وغیرہ ہی لینے نہ آتے بلکہ یہاں اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے ملنا ان کا اولین مقصد ہوتا۔ کمر جی اور بدھن اس دکان کو رونق بخشنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جب ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے تو ملک کے بہت سے علاقوں میں کرفیو لگانا پڑا۔ جس علاقے

میں قیوما کی دکان تھی وہاں بھی کرفیو لگا دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب قیوما نے اپنی دکان کو بند رکھا۔

" کرفیو ختم ہونے کے بعد اگر چہ قیوما نے اپنی دکان کھولی لیکن اس کے بعد وہاں پہلی سی رونق کبھی نہ آ سکی۔ بدھن نے حقہ بھی بھر کے رکھ دیا تھا اور وہ اونچے نیچے پایوں والی بینچ بھی حسبِ معمول بچھا دی تھی پھر بھی ٹکنے کا کوئی نام نہ لیتا تھا۔ لوگ جلدی جلدی سودا سنبھالتے اور پیسے پھینکتے اور گلیوں میں سنک جاتے اور پھر کواڑوں کے دھاڑ دھاڑ بند کرنے کی آوازیں آتیں"۔[۱۰]

تقسیم ہند کے بعد ملک کے حالات اور بھی خراب ہو گئے تو واحد متکلم، قیوما، بدھن اور الطاف سب کو ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔ اگر چہ پاکستان میں بھی آ کر قیوما نے دکان کھولی لیکن قیوما کی دکان کو رونق بخشنے والے ایک ملک میں ہونے کے باوجود ایک جگہ جمع نہ ہو سکے اور نہ ہی کبھی قیوما کی دکان میں وہ محفلیں اور رونقیں لوٹ کر آ سکیں جو ہندوستان میں ہوا کرتی تھیں یہ انتظار حسین کے لیے بہت بڑا دکھ ہے اپنے اس دکھ کو انھوں نے واحد متکلم کے ذریعے اس طرح بیان کیا۔

''پھر میں پاکستان چلا آیا۔ یہاں آ کر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا ہے ایک بوریت سی ذہن پر طاری رہتی ہے۔ مجھے گھن لگ گیا ہے۔ میں گھلتا چلا جا رہا ہوں۔ ایک دن انارکلی بازار میں نمبردار سے مڈبھیڑ ہو گئی، بے چارے بہت روتے تھے۔۔۔ یہ انارکلی بھی خوب ہے بچھڑے ہوئے پناہ گزیں یہاں ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔''[۱۱]

انتظار حسین کا یہ افسانہ ماضی کی یادوں کے بارے میں ہے اس پورے افسانے میں انتظار حسین نے قیوما کی دکان اور اس سے محفل جمانے والے لوگوں کی مختلف باتوں کو بیان کر کے ماضی کی یادوں کو تازہ کیا ہے۔

''اس افسانے کا بنیادی موضوع۔۔۔ ایک فرد ہی نہیں بلکہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہے، وہ ایک دکان دار ہی نہیں تھا.....، بلکہ مجلسی زندگی کا محور تھا، جس کے گرد بے شمار لوگ خوش گپیاں کرتے تھے اچھا وقت گزارتے تھے۔''[۱۲]

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسد
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

لوگ جب ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کر جائیں تو اس مقام کی رونقیں بھی انھیں کے ساتھ ہجرت کر جاتی ہیں جن کی صرف یادیں رہ جاتی ہیں قیوما واحد متکلم اور ان کے اہل محلّہ کے مقام بدل جانے کے بعد اگر چہ وہ پھر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں مگر وہ بات پھر کبھی پیدا نہ ہو سکی۔ قیوما کی دکان کی محفل آرائی اب محض تصورات میں رہ گئی جو پھر وجود میں نہ آ سکی۔

اپنا گھر:

مسعود اشعر کے اس افسانے میں بکھرے ہوئے ایک مسلمان خاندان کے مسائل کو بیان کیا ہے تقسیمِ ہند کے نتیجے میں احمد پاکستان میں آ گیا جب کہ اس کے خاندان کے دوسرے افراد نے ہندوستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔

افسانے کا مرکزی کردار احمد پچاس سال کے بعد ہندوستان میں اپنے رشتے داروں سے ملنے گیا تو جانے سے پہلے اس کے دل میں بہت سے اندیشوں نے گھر کر لیا۔

''پچاس برس بعد وہاں جا کر اسے کیسا لگے گا؟ اسے خوشی ہوگی یا صدمہ، وہاں سب کچھ ویسا تو نہیں ہو گا جیسا وہ چھوڑ کر آیا تھا تو پھر کیسا ہوگا؟ بدل گئی ہوگی سب چیزیں؟ ۔۔۔ سڑکیں اور گلیاں تو وہی ہوں گی پھر اپنے عزیز رشتے دار تو ہوں گے نہ۔ اس عرصے میں دو تین موتیں ہی تو ہوئیں ہیں۔۔۔، بلکہ اب تو رشتے داروں کی تعداد اور بھی بڑھ گئی ہے۔ بچے اور پھر بچوں کے بچے چالیس پچاس برس میں کتنی نسلیں بڑھ جاتی ہیں۔''[۱۳]

ہندوستان پہنچ کر احمد کو احساس ہوا کہ واقعی ہر چیز بدل چکی تھی۔ اس کے گھر، محلّہ، شہر غرض ہر جگہ کا نقشہ بدل چکا تھا۔ عمارتوں، دکانوں اور انسانوں کے ہجوم کی وجہ سے اسے ایسے لگا جیسے اسٹیشن، سڑکیں اور شہر چھوٹے ہو گئے ہیں۔ افسانہ نگار نے احمد کی دلی کیفیت کو اس کی زبانی یوں بیان کیا کہ:

''میں نے اسٹیشن سے باہر قدم رکھتے ہی جو پہلا بورڈ دیکھا تھا اس پر دیوناگری رسم الخط میں لکھا تھا۔ انجمن اہل سنت والجماعت۔ میرے لیے یہ پہلا صدمہ تھا''[۱۴]

جگہوں کے علاوہ خوراک، لباس اور لوگوں کے رویے میں بھی تبدیلی آ چکی تھی۔ کھانے کی اشیا بھی تبدیل ہو گئی تھیں جس پر احمد نے حیرت سے کہا:

۔۔۔ ''تمھیں بھی یہ مرغ مسلم اور کوفتے کباب ہی پکانا رہ گئے تھے۔ میں تو یہاں کڑوے تیل میں پکائی ہوئی آلو میتھی کی بھجیا، کھٹی ہری مرچیں، ہینگ کا بگھار لگے کالے ارد۔ لچ لچ اور ارد کی دال کی کھچڑی کھانے آیا تھا''[۱۵]

اصل میں احمد ماضی کی ہر چیز سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا جو چیزیں اس نے بچپن مین کھائی تھیں وہ پھر سے ان کا ذائقہ چکھنا چاہتا تھا۔

احمد نے اپنے گھر کی ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا تقریباً ہر چیز اپنی جگہ موجود تھی صرف باورچی خانے کی جگہ ڈائننگ روم بن گیا تھا۔

کھانے پینے اور رسمی باتوں کے بعد گلے شکووں کا دور شروع ہو گیا۔ احمد کے ہندوستانی رشتے

داروں کو سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس سے شکوہ تھا کہ وہ اتنا عرصہ ان سے لاتعلق کیوں رہا۔ احمد کے تینوں چچا اور والد اور تینوں بھائی ہندوستان ہی میں رہتے تھے۔ ایک بار احمد کے والد اس سے ملنے کے لیے پاکستان آئے تو وہیں ان کا انتقال ہو گیا۔ چچا میاں کو شکایت تھی کہ احمد نے بروقت انھیں اس خبر کی اطلاع نہ دی۔

احمد نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''ان دنوں ۱۹۶۵ء کی جنگ چھڑی ہوئی تھی خطوط آ جا ہی نہیں رہے تھے۔''[۱۶]

والد کے انتقال کے ذکر ہی سے احمد کو اپنی چچی کے انتقال کا خیال آ گیا جس کے بارے میں چچا میاں احمد کو مطلع نہ کر سکے تھے۔ چچا نے اپنی مجبوری بتائی:

''اس وقت بھی دونوں ملکوں میں جنگ ہو رہی تھی، سرحدیں بند تھیں۔''

''وہ اکہتر کی جنگ تھی''۔ احمد نے جلدی سے کہا۔۔۔ اس کی ہنسی نکل گئی۔ ''ہم ساری باتیں جنگوں اور جھگڑوں کے حساب سے ہی یاد رکھتے ہیں۔''[۱۷]

احمد کو رشتے داروں سے رابطہ رکھنے کے لیے صرف ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی جنگ ہی رکاوٹ نہ بنی۔ بلکہ اصل مسئلہ اس وقت پیش آیا جب اس نے خفیہ ذرائع سے سری نگر کے رشتے داروں سے رابطہ رکھنے کے لیے ایک دوست کی مدد کی۔ احمد نے اپنے چچا کو اپنے دوست کے بارے میں بتایا جس کے ماں باپ، بہن، بھائی اور رشتے دار سب سری نگر میں رہتے تھے۔

"ان دنوں سری نگر سے پاکستان تو خط آ سکتا تھا مگر وہاں سے سری نگر کوئی خط نہیں جا سکتا تھا۔ اس وقت تک لاہور میں ہندوستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کا دفتر تھا۔ اس صاحب نے سری نگر خط بھیجنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ وہ ہندوستانی ڈپٹی ہائی کمشنر کے دفتر سے ڈاک کے ہندوستانی ٹکٹ لے آتے تھے"۔[۱۸]

ڈاک کے ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے بھی انھیں الگ سے محنت کرنا پڑی۔

''انھوں نے وہاں کے کلرکوں سے دوستی کر لی تھی وہ انھیں ٹکٹ دے دیتے تھے۔ وہ خط لکھ کر لفافے میں بند کرتے، ہندوستانی ٹکٹ لگاتے اور کسی ایسے شخص کو دے دیتے جو ہندوستانی میں خط لکھتا رہتا تھا، وہ شخص ان کے لفافے کو اپنے لفافے میں رکھتا اور ہندوستان کے کسی بھی شہر میں اپنے عزیز کو بھیج دیتا، لکھ دیتا کہ یہ دوسرا لفافہ لیٹر بکس میں ڈال دینا..... اس مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا تو میں نے بھی ان کا لفافہ اپنے لفافے میں رکھ دیا۔ مجھے کیا خبر تھی، یہ مصیبت آ جائے گی۔''[۱۹]

اس خط میں جو لکھا تھا انھوں نے اسے غلط رنگ دے کر بہت بڑا مسئلہ بنا دیا۔

''۔۔۔ بچوں کے پھنسیاں نکل آئی ہیں۔ بیوی کے سر میں درد رہتا ہے۔ وہ کہتے تھے یہ پھوڑے پھنسیاں اور سر کا درد، کوڈ ورڈز ہیں۔ خفیہ اشارے ہیں۔''[۲۰]

خط پکڑے جانے کے بعد احمد کو ہندوستان کا ویزہ حاصل کرنے میں کئی دشواریاں ہوئیں اس کے خلاف ایک فائل تیار کی گئی اور جب بھی احمد نے ویزے کے لیے درخواست دی اسے مسترد کر دیا گیا۔
ادھر ہندوستان میں چچا میاں کے خاندان کو بھی طرح طرح کے سوالات کر کے پریشان کیا گیا۔ تفتیش کا یہ سلسلہ چھے ماہ تک جاری رہا۔

احمد نے ڈپٹی کمشنر کو ساری بات سچ سچ بتا دی لیکن وہ اپنے اعتماد کو بحال نہ کر سکا، اور نہ ہی اسے ویزا مل سکا ان کا کہنا تھا کہ:

''دلوں میں میل آ جائے تو پھر بدگمانیاں پیدا ہو ہی جاتی ہیں اور تم بھی اپنی بدگمانیوں کی بھینٹ چڑھ گئے ہو۔''[۲۱]

کئی بار مایوس ہونے کے بعد احمد نے ویزے کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا لیکن اسے اچانک حکومت کی طرف سے ہندوستان میں تین روزہ کانفرنس کے لیے ویزا مل گیا۔ تین دن کی مدت میں اس کے لیے سب رشتے داروں سے ملنا ممکن نہ تھا اور نہ ہی اسے ہر شہر کا ویزا ملا تھا۔

''۔۔۔ میں تھانو لے کیسے جا سکتا ہوں؟ میرے پاس تو وہاں کا ویزا ہی نہیں ہے۔۔۔ تھانو لے جانے کو اس کا کتنا دل چاہتا تھا۔ اس کی وہ گلیاں، وہ باغ اور وہ کھیت دیکھنے کو اس کا دل تڑپتا تھا جہاں اس کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔''[۲۲]

تین دنوں میں احمد نہ تو اپنے سارے رشتے داروں سے مل سکا نہ ساری جگہیں دیکھ سکا اور نہ ہی سب سے دل بھر کر باتیں کر سکا البتہ تین ہی دنوں میں اسے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے جو بدگمانیاں تھیں وہ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ختم نہ ہو سکی تھیں۔ اسے ہر ایک نے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ تقسیم ہند کے ذمے دار پاکستانی مسلمان ہیں۔ اس لحاظ سے ہندو مسلم فسادات کے ذمے دار بھی مسلمان ہی ہیں۔ اور طویل جدوجہد اور فسادات کے بعد جو ملک وجود میں آیا وہ ایک کمزور ملک ہے۔

احمد کے ایک رشتے دار کا کہنا تھا۔

''آپ کے ملک کی وجہ شہرت تو سیاسی لیڈروں کی لوٹ مار اور کرپشن ہے''[۲۳]

احمد نے بھی اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے کہہ دیا:

''تم لوگ بھی ہم سے پیچھے نہیں ہو۔ ابھی پچھلے دنوں آپ کے ایک بڑے اخبار کی رپورٹر ہمارے ہاں آئی تھی۔ کرپشن کی بات چلی تو میں نے تمہارے بہار کا ذکر کر دیا۔ معلوم ہے اس نے کیا کہا؟ اس نے کہا، ہمارے یہاں تو کہا جاتا ہے کہ اگر پاکستان کو تباہ کرنا ہے تو اسے بہار دے دو۔''[۲۴]

مولوی عبدالسلام خان جو کانگریسی تھی ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو آزادی کے نتیجے میں کئی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے گھر بار، جاگیر اور وطن کے علاوہ انھوں نے بہت سے تاریخی یادگاریں چھوڑیں، وہ اس حقیقت کو بھی ماننے سے انکار کر رہے تھے کہ تقسیمِ ہند نہ ہونے کی صورت میں ہندو اور سکھ اکثریت کی وجہ سے مسلمانوں پر حاوی ہو جاتے۔

ایک طرف مولوی عبدالسلام کے اور دوسری طرف احمد کے دوست ماسٹر ممتاز کے نظریات تھے ماسٹر ممتاز جو کسی زمانے میں کمیونسٹ رہ چکا تھا، لیکن تقسیمِ ہند کے بعد اسے احساس ہوا کہ اس کی انسان دوستی پر شبہ کیا جانے لگا ہے۔

آزادی کے فوراً بعد جب احمد اور ممتاز ہندو شرنارتھیوں کے لیے کتابوں کا انتظام کرنے گئے تو اس دکان دار نے فوراً سوال کیا کہ اس کی ذات کیا ہے؟ احمد کے لئے یہ سوال بڑا تکلیف دہ تھا اس سوال کے جواب میں ماسٹر ممتاز نے بتایا کہ وہ گپتا ذات ہے۔ بعد میں ماسٹر ممتاز نے احمد کو حالات کی نزاکت سنبھالتے ہوئے کہا کہ:

> ''۔۔۔اگر دکاندار کو معلوم ہو جاتا کہ ہم مسلمان ہیں تو وہ کہتا۔ تمھیں شرنارتھیوں سے کیا ہمدردی ہے۔ یاد نہیں، ہم ایک کانگریسی لیڈر کے پاس پیسے مانگنے گئے تھے تو اس نے کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا۔ شرنارتھیوں کو بھیک مانگنا کیوں سکھا رہے ہو۔''۲۵

ممتاز نے اپنے بارے میں بتایا:

> ''تمہارے جانے کے بعد میرے ساتھ بہت برا ہوا۔۔۔ پہلے میرا تبادلہ ٹھری گھڑوال کر دیا گیا پھر پیلی بھیت بھیج دیا۔ ریٹائر ہوا تو اب تک پنشن کا جھگڑا چل رہا ہر وقت سی آئی ڈی والے میرا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔''۲۶

ہندوستان کے سیاسی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد ممتاز نے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ جو مسلمان ہندوستان میں قیام پذیر ہیں وہ مظلوم اور محکوم ہیں۔

> ''ہندو مسلمان میں فرق تو اب بھی نہیں کرتا، مگر حالات نے مسلمانوں کو آج کا سب سے مظلوم طبقہ بنا دیا ہے.....اس شہر کے قریب قریب ہر گھر میں عورتیں اور بچے پیڑیاں بنا رہے ہیں کار چوبی کر رہے ہیں یا چکن بنا رہے ہیں اور مرد سائیکل رکشہ چلا رہے ہیں۔ پڑھنے کے لیے ان کے پاس وقت ہے نہ پیسا۔''۲۷

عبدالسلام اور ماسٹر ممتاز کے برخلاف چچا میاں کے خیال میں اعتدال تھا۔ انھوں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ ان کے بچے ہندوؤں کے ساتھ کاروبار بھی کر رہے تھے۔ اس بات پر احمد کو حیرت ہوئی۔

''عقیل ہندوؤں کے ساتھ بھی کاروبار کرتا ہے؟'' اب احمد کے اندر کا پاکستان مسلمان جاگ اٹھا تھا۔

''کاروبار میں ہندو مسلمان نہیں ہوتا۔''

اور ہندو مسلم جھگڑے؟ احمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''وہ بھی چلتے رہتے ہیں۔ یہ کاروبار ہے، وہ سیاست ہے، جب کاروبار اور سیاست اکھٹے ہو جاتے ہیں تو ایسا بھی ہو جاتا ہے۔''[۲۸]

احمد کے یہ خیالات صرف ایک کردار کے خیال نہیں۔ بلکہ بہت سے پاکستانیوں کے خیالات ہیں جس کی وجہ ان کے لاشعور میں چھپا ہوا خوف اور عدم اعتماد ہے۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے ایک دوسرے کے خلاف جو نفرت اور بدگمانیاں پیدا ہوئیں۔ وہ پچاس سال گزرنے کے بعد بھی ختم نہ ہو سکیں آج بھی دونوں ملکوں کے لوگ نہ صرف ایک دوسرے کے خلوص پر شک کرتے ہیں بلکہ انھیں اپنے ملک کے سامنے دوسرا ملک کم زور اور ترقی اور خوش حالی کے لحاظ سے اپنے ملک سے بہت پیچھے نظر آتا ہے۔

افسانے کا کردار احمد اگرچہ ہندوستان میں ایک سرکاری کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا تھا لیکن اپنے پرانے وطن کو دیکھنے اور پرانے دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے کے لیے وہ بے تاب تھا۔ اس کی سوچ، خیالات اور گفتگو میں ماضی چھپا ہوا تھا۔

ہندوستان میں آ کر اسے احساس ہوا کہ یہ ہندوستان اُس ہندوستان سے مختلف ہے جسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اور دوبارہ دیکھنے کے لیے وہ عرصہ دراز سے کوشش کر رہا تھا۔

ڈار سے بچھڑے:

اس افسانے میں محمد اشرف نے پاکستان میں رہنے والے ان مہاجرین کا ذکر کیا ہے جو ایک لمبا عرصہ گزارنے کے بعد بھی اپنے پرانے وطن کو فراموش نہیں کر پائے۔ پرانے وطن اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کے لیے وہ آج بھی بے چین ہیں لیکن معاشی مجبوریاں اور ملازمتیں یا کاروبار ان کے لیے رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

واحد متکلم، نواب غلام علی اور اس کی بیوی اور وزیر الدین اور اس کی بیوی افسانے کے کردار ہیں۔

افسانے کا مرکزی کردار ۱۸ سال کی عمر میں ہندوستان (یوپی) سے پاکستان ہجرت کر کے آ گیا تھا اور پاکستان میں اسے سرکاری نوکری بھی مل گئی تھی لیکن پرانے وطن اور بچپن کی یادیں اسے ہمیشہ ستاتی رہیں۔ ہندوستان جانا اس کے لیے ناممکن نہ تھا لیکن اس کی نوکری ایسی تھی کہ اسے حکومت سے اجازت ملنا مشکل تھا۔

یہی کیفیت غلام علی کی بیوی کی تھی وہ بھی یوپی کی رہنے والی تھی اور اس کی شدید خواہش تھی کہ کم از کم

ایک بار وہ ہندوستان کو دوبارہ دیکھ کر آئے، لیکن اس کا شوہر چوں کہ تقسیم ہند سے پہلے ہی پاکستان میں رہتا تھا اور اسے ہجرت کے کرب سے گزرنا نہیں پڑا تھا۔ اس لیے اس کے لیے وطن کی یاد، یا اسے دیکھنے کی تڑپ بے معنی جذبات تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی اس کی بیوی نے ہندوستان جانے کی بات کی وہ اسے کسی نہ کسی بہانے سے ٹالتا رہا۔ غلام علی کی بیوی نے اس مسئلے کو حل کرنے کی آخری صورت یہ نکالی کہ وہ اپنے شوہر کے افسر (واحد متکلم) سے مدد حاصل کرے۔ لیکن غلام علی نے واحد متکلم کو اپنی بیوی سے ملوانے سے پہلے اسے اپنی معاشی مجبوریاں بتاتے ہوئے کہا کہ وہ اس کی بیوی کو سمجھا دے کہ اس کا پاسپورٹ نہیں بن سکتا۔

غلام علی کے علاوہ وزیر الدین کی بیوی بھی ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آئی تھی۔ وطن شہر، رشتے داروں اور عزیزوں کی یادوں نے اسے بھی ہندوستان جانے کے لیے مجبور کر دیا۔

اس نے چوری چھپے پرمٹ بنوالیا اور پھر کانوں کا زیور بیچ کر وزیر الدین سے اجازت مانگی۔

---''اس نے اوپری دل سے اجازت دے دی اور رات کو اس کے بکسے سے پرمٹ نکال کر جلا دیا صبح اٹھی تو پرمٹ غائب۔ اس نے فیل مچایا، اور وزیر الدین سے کہا کہ یہ اسی کا کام ہے۔ وزیر الدین نے پہلے تو بہانے ملائے۔ اور پھر..... ڈنڈا لے کر جٹ پڑا کہ حرام زادی تین چار مہینے تک کیا تیری ماں مجھے روٹی پکا کر کھلائے گی۔''[۲۹]

غلام علی نے واحد متکلم کو وزیر الدین کا یہ کارنامہ اپنی زیادتیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے سنایا تھا لیکن غلام علی نے جس انداز میں وزیر الدین کی وکالت کی تھی واحد متکلم کو غلام کی سوچ کی بے حسی اور خود غرضی پر حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اس وقت متکلم کی ذہنی کیفیت کو افسانہ نگار نے اس طرح بیان کیا ہے۔

''غلام علی---تم بہت کمینے اور بہت بھولے ہو۔ تم اور تمہارا دوست نہیں جانتے کہ اس جگہ سے بچھڑ کر انسان کی کیا حالت ہو جاتی ہے جہاں اس نے پیدا ہو کر ماں---اور باپ کی شفیق انگلیوں کے لمس کو اپنے سر پر محسوس کیا ہو..... جہاں اس کا بچپن لڑکپن سے گلے ملا ہو۔ تمھیں اس کا علم نہیں غلام علی کہ انسان ان لمحوں کو کتنا عزیز رکھتا ہے جن لمحوں میں اس کا بھولا ذہن معصوم سر پھرے اور خود سر جذبوں کو خون پلا کر پالتا ہے۔''[۳۰]

جب واحد متکلم کی غلام علی کی بیوی سے ملاقات ہوئی تو اسے ایک طرف غلام علی کی التجائیں تھیں اور دوسری طرف اس کی بیوی کی آخری امید اور اصرار تھا۔ وہ عجیب کش مکش اور بدحواسی میں مبتلا ہو گیا، لیکن غلام علی کے خیالات سے شدید اختلافات کے باوجود اسے اسی کا پاس رکھنا پڑا اور اس نے غلام علی کی بیوی سے کہا کہ ''تمھارا پاسپورٹ نہیں بن پائے گا۔''

واحد متکلم کا جواب سن کر غلام علی کی بیوی بے انتہا دکھی ہو گئی۔ لیکن وہ بھی اپنی بات کو درست ثابت

کرنے اور منوانے کے لیے کوئی دلیل پیش نہ کر سکی۔ جس سے اس کی وطن کو دیکھنے کی تڑپ اور بے چارگی ثابت ہوتی۔ افسانہ نگار نے اس عورت کی کیفیت کو اس طرح بیان کیا ہے:

''۔۔۔ کیوں بھیا۔۔۔ آپ بھی نہیں بنوا سکے۔ آپ تو سب سے بڑے دروغہ ہیں۔''

''ہاں۔ دیکھ لو سب سے بڑا دروغہ خود اپنا پرمٹ نہیں بنوا سکتا تو تمھارے لیے کیسے بنوا پائے گا۔''

''لیکن وزیر الدین بھائی کی گھر والی نے تو اپنا پرمٹ بنوا لیا تھا۔'' وہ بولی جیسے مایوسی کے عالم میں یہی ایک حوالہ اس کا سہارا رہ گیا ہو۔۔''[۳۱]

جب اس کی ساری تدبیریں اور آخری امید بھی ختم ہوگئی تو اس نے اپنی بے بسی پر صبر کر لیا۔

افسانے کا کردار نواب بھی ہجرت کا مارا ہوا ہے اس کا دکھ واحد متکلم، غلام اور وزیر الدین کی بیوی سے مختلف نہ تھا۔ کئی سالوں کے بعد اچانک واحد متکلم اور نواب کی ملاقات شکار کھیلنے کے دوران ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان جاتے ہیں اور ماضی کی شدت کو یاد کر کے کہتے ہیں:

''میں نے اس ایک لمحے میں تیس برس کا سفر طے کر لیا۔۔۔ اور میرے حافظے نے بڑی سبک دستی سے بچپن کی امنگوں، لڑکپن کی جستجو اور شروع جوانی کے ولولوں کے بے حد خوش نما رنگ بھر دیے۔ میں نے یوپی کے گنگا جمنا کے دوآبے کو بالکل واضح چمکتا۔۔۔ ہوا دیکھا۔ وہاں کی مسجدیں۔۔۔ وہاں کے سارے محلے ساری گلیاں دیکھ ڈالیں۔ قصبے کے سارے گھر دیکھ ڈالے، پھر اپنا مکتب دیکھا پھر اسکول دیکھا سارے بزرگ اور تمام ماسٹر شفیق چہرے لیے میرے سامنے کھڑے تھے۔''[۳۲]

واحد متکلم کی طرح نواب کو بھی بہت سی باتیں یاد آئیں اور اس نے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے بہت سے یادگار واقعات کو دہرایا اور بچھڑے ہوئے دوستوں کو یاد کیا۔ نواب پرانے وطن اور ساتھیوں سے ملنے کے لیے بے تاب تھا اور ایک بار پھر ان سب کے درمیان جانا چاہتا تھا لیکن اس نے اپنی مجبوری یہ بتائی کہ میں کراچی سے ایک دن بھی باہر رہوں تو دو ہزار کا نقصان ہو جاتا ہے۔

افسانے میں واحد متکلم، نواب، وزیر الدین اور غلام علی کی بیوی، سب اپنے آبائی وطن شہر محلے، گلیوں، دوستوں اور رشتے داروں کو دیکھنے کے لیے بے چین ہیں لیکن ہر ایک کے ساتھ اپنی اپنی مجبوریاں ہیں۔

واحد متکلم سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے حکومت کی پوچھ گچھ سے ڈر رہا ہے۔ نواب کے پاس وقت اور پیسہ دونوں ہیں لیکن پیسے خرچ کرنے کا حوصلہ کہاں سے لائے۔ بقول فیض احمد فیض:

تجھ سے بھی دل فریب ہیں غم روزگار کے

غلام علی کو اپنی بیوی کا بھارت جانا برا نہیں لگتا لیکن وہ چار پانچ سو روپے خرچ ہونے سے ڈرتا ہے اور مجبوراً بیوی کو شوہر کے جھوٹ کو سچ سمجھ کر حالات سے سمجھوتا کرنا پڑا۔

وزیرالدین کی بیوی کا تجربہ سب سے زیادہ تلخ ہے۔ اسے پرانے وطن کو دیکھنے کے شوق میں اس نے اپنے زیور بیچ کر پرمٹ بنوالیا، لیکن اسے شوہر کی اجازت نہ مل سکی کیوں کہ اس کا شوہر تین چار مہینے تک کہیں اور کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔

ان کرداروں کی مجبوریوں کو واحد متکلم نے افسانے میں اس طرح بیان کیا:

''۔۔۔ہم لوگ بہت بے اختیار۔۔۔لاچار۔۔۔مجبور۔۔۔ اور بے بس ہیں میں اگر ایک بار ہندوستان جانے کے لیے اس ملازمت سے استعفیٰ دے دوں تو گھر والوں کی زندگی کی گاڑی کیسے آگے بڑھے گی اور نواب تم اگر فیکٹری چھوڑ کر بیس دن کو بھی پاکستان چھوڑ دو تو چالیس پچاس ہزار کا نقصان کون بھرے گا۔''۳۳

تقسیم ہند کے بعد مسلمانوں نے اپنی زندگی کے تحفظ اور مذہبی آزادی اور سماجی انصاف حاصل کرنے کے لیے ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی تھی۔ انھیں کچھ نہ کچھ زندگی کے تحفظ کے ساتھ ساتھ کسی حد تک سماجی انصاف بھی مل گیا، لیکن وہ ماضی کی یادوں سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکے۔

آج بھی انھیں ماضی کی یادیں اپنے آبائی وطن کو پھر سے دیکھنے اور بچھڑے ہوئے ساتھیوں سے ملنے کے لیے اکساتی ہیں لیکن کہیں معاشی مجبوریاں اور کہیں قانونی تقاضے انھیں اس کی اجازت نہیں دیتے۔

بدن کا طواف:

امراؤ طارق کا افسانہ ''بدن کا طواف'' تقسیم ہند کے کچھ عرصے کے بعد ہندوستان سے پاکستان آنے والی ایک تنہا اور بے بس لڑکی کے بارے میں ہے۔

تقسیم ہند کے نتیجے میں افسانے کے مرکزی کردار منیرہ کے گاؤں کے بیشتر لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے لیکن منیرہ اور اس کے والدہ نے ہندوستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔ کچھ عرصے بعد منیرہ کی والدہ کا انتقال ہو گیا منیرہ تنہا رہ گئی ایک عرصے کے بعد اس کے خالو ہندوستان آئے اور منیرہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ وطن چھوڑتے وقت منیرہ کی دلی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:۔

''خالو جان کے ساتھ پاکستان روانہ ہوئی تو ایسا لگا کہ اپنے پیچھے یادوں، چاہتوں اور پیار کے خزانے چھوڑ چلی ہو جب بیل گاڑی ست رفتاری کے باوجود گاؤں لمحے بھر میں درختوں کے جھنڈ کے پیچھے چھپ گیا تو اس کے اندر جیسے کوئی چیز چھن سے ٹوٹ گئی ہو۔''۳۴

منیرہ پاکستان میں بہت سی امیدیں اور ارمان لے کر آئی تھی اسے یقین تھا کہ کچھ ہی عرصے کے بعد اس کی شادی اپنے منگیتر اور خالہ زاد سلیم کے ساتھ ہو جائے گی لیکن حالات اس کے خیالات سے بالکل

مختلف نکلے، سلیم کے رویے میں بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھی، وہ مذہب، گھر اور اخلاقی اقدار سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ بقولِ مہناز ضمیر:

''جمہوریت کے نام لیواؤں نے اپنا راگ اس قدر الاپا کہ بیشتر نوجوانوں کو مذہب سے بے گانہ کر دیا، نام نہاد ترقی پسندی نے ان کے اذہان کو اس درجے متاثر کیا کہ نیک و بد کی تمیز جاتی رہی۔''۳۵

پاکستان آ کر منیرہ نے ایک نرسنگ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ سلیم اسے باقاعدگی سے اسکول چھوڑنے اور لینے جاتا۔ بہت جلد سلیم نے منیرہ کو اعتماد میں لے لیا۔ اور شادی کا لالچ دے کر اس کی بے حرمتی کرتا رہا اور جب اپنا دل بھر گیا تو ایک ہزار کے عوض اس کا کسی اور سے سودا کر دیا۔ مجبوراً منیرہ کو گھر چھوڑنا پڑا۔

اس کے بعد منیرہ کو مردوں سے سخت نفرت ہوگئی لیکن ایک دن ڈاکٹر اختر نے منیرہ کے دل سے مردوں سے بدگمانیاں نکال دیں اور یوں منیرہ ایک بار پھر دھوکے میں آ گئی۔ اس بار بھی منیرہ کی خوش فہمیاں زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکیں۔ ڈاکٹر اختر کا یہ جملہ اسے خوابوں کی دنیا سے باہر لے آتا ہے:

''منیرہ میں ری کنڈیشنڈ کار رکھ سکتا ہوں اور کچھ نہیں۔''۳۶

امراؤ طارق اس افسانے کے ذریعے یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تنہا اور بے بس عورت اپنوں میں ہو یا غیر میں مردوں کے لیے وہ ایک کھلونا ہی ہوتی ہے۔ جیسا کہ افسانہ کی کردار ''منیرہ'' کے ساتھ اپنوں نے وہی سلوک کیا جو فسادات اور ہجرت کے دوران ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمان عورتوں کے ساتھ کیا۔

دراڑوں میں سانپ:

امراؤ طارق ایف آئی اے کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے وہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں نیک نام تھے۔ انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا، بے شمار مسائل میں لت پت ان گھرانوں کو بھی دیکھا جو سکون اور روشنی کی تلاش میں پاکستان آئے تھے۔ لیکن ناکام ہجرت نے ان کی قوت گویائی بھی چھین لی۔

امراؤ طارق کے افسانے ''دراڑوں میں سانپ'' میں قیام پاکستان کے بعد لسانی اور علاقائی بنیاد پر فرقے وارانہ پابندیوں کا ذکر کیا ہے۔

تعلیمی اداروں اور ملازمت کے حصول کے لیے فارم پر کرتے وقت بھی یہ لکھا جاتا ہے کہ اس کی مادری زبان کیا ہے؟ اور اس کے والدین کا تعلق کہاں سے ہے؟

ہجرت کے اکتیس سال بعد بھی افسانے کے مرکزی کردار کا بیٹا سوال کرتا ہے:

''پاپا آپ کی جائے پیدائش کہاں کی ہے؟'' تو اس کے والد کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔

''بیٹے تم اتنے سرکش ظالم اور بے حس ہو کہ تمھیں میری اذیت کا کوئی احساس نہیں۔''

''پاپا مگر مجھے تو یہ فارم پر کرنا ہے جس میں میری اور میرے باپ کی جائے پیدائش پوچھی گئی ہے۔''۳۷

اس افسانے کے ذریعے امراؤ طارق نے ان لوگوں پر طنز کیا ہے، جو معاشرے کو علاقوں کی بنیاد پر فرقوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

الغرض تقسیم، فسادات اور ہجرت کے نتیجے میں مہاجرین کو مختلف تجربات کے نتیجے میں غم والم کے مختلف احساسات سے گزرنا پڑا، لیکن بچھڑنے والوں کا غم ایسا تھا جس سے کوئی بھی مہاجر بچ نہ سکا۔ یوں تو ملک بھی آزاد ہو گیا اور بظاہر وہ بھی آزاد ہو گئے لیکن آزادی کے بعد بھی سر اٹھا کر زندگی گزارنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ وہاں ہندو مسلم فسادات تھے تو یہاں لسانی اور علاقائی بنیادوں پر لڑائی جھگڑے تھے۔ کہیں امیر، غریب، کہیں طاقت ور اور کمزور ایک دوسرے کے سامنے سینہ تانے کھڑے تھے۔ ان حالات میں مہاجرین ماضی میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ صرف مہاجرین ہی نہیں بلکہ ہمارے شاعر اور ادیب بھی صبح و شام اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں اور ان ٹھکانوں کی یاد میں کھوئے رہتے جہاں وہ اپنی زندگی کا ایک حصہ گزار چکے تھے اس غم واحساس کو انھوں نے اپنے افسانوں میں اس کمال سے پیش کیا کہ جو لوگ ہجرت کے کرب سے ناواقف تھے وہ ان افسانوں کے ذریعے اس کرب سے آشنا ہوئے۔ ساحر لدھیانوی نے کیا خوب کہا ہے:

زمین نے خون اگلا، آسمان نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دن بدلے، تو انسانوں پہ کیا گزری

الغرض تقسیم وفسادات کے بعد اردو افسانے کا سب سے بڑا موضوع یہی تقسیم اور فسادات تھے۔ نہ صرف افسانے بلکہ ناول اور ناولٹ بھی ان موضوعات سے نہ بچ سکے۔ یہ کہانیاں اردو افسانے ہی کا ایک باب نہیں برصغیر کی ایک تاریخ بھی ہے۔ وقت گزرتا جائے گا لیکن یہ تاریخ نہ مٹائی جا سکتی ہے اور نہ ہی ان موضوعات پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔

حواشی:

۱۔ قرۃ العین حیدر، ''پت جھڑ کی آواز'' مکتبہ اردو ادب، سن ندارد، ص ۱۸۹۔
۲۔ ایضاً، ص ۱۹۸۔
۳۔ خورشید زہرہ عابدی، ''ترقی پسند افسانے مع عورت کا تصور'' جے آر آفسیٹ پرنٹرز، ۱۹۸۷، ص ۲۰۶۔
۴۔ افسانہ ''جلاوطن''، مشمولہ ''پت جھڑ کی آواز''، ص ۶۷۔۶۶۔
۵۔ ایضاً، ص ۶۸۔
۶۔ ایضاً، ص ۸۰۔
۷۔ قراۃ العین حیدر، افسانہ ''حسب نسب''، مشمولہ یاد کی ایک دھنک جلے، رفعت پبلشرز، لاہور، سن ندارد، ص ۱۳۶۔

۸۔ ایضاً،ص۱۵۶۔
۹۔ انتظار حسین، افسانہ ’’استاد‘‘ مشمولہ ’’گلی کوچے‘‘، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص۱۹۶۔
۱۰۔ افسانہ ’’قیوما کی دکان‘‘، مشمولہ ’’گلی کوچے‘‘، ص۱۸۔
۱۱۔ ایضاً،ص۲۱۔
۱۲۔ ایضاً،ص۲۶۔
۱۳۔ مسعود اشعر، ’’اپنا گھر‘‘، مشمولہ ماہ نامہ ’’شب خون‘‘، الٰہ آباد، جون۲۰۰۳، ص۳۔
۱۴۔ ایضاً،ص۱۷۔
۱۵۔ ایضاً،ص۱۶۔
۱۶۔ ایضاً،ص۵۔
۱۷۔ ایضاً،ص۶۔
۱۸۔ ایضاً،ص۶۔
۱۹۔ ایضاً،ص۶۔
۲۰۔ ایضاً،ص۶۔
۲۱۔ ایضاً،ص۶۔۷۔
۲۲۔ ایضاً،ص۵۔
۲۳۔ ایضاً،ص۱۵۔
۲۴۔ ایضاً،ص۱۵۔۱۶۔
۲۵۔ ایضاً،ص۱۷۔
۲۶۔ ایضاً،ص۱۷۔
۲۷۔ ایضاً،ص۱۷۔
۲۸۔ ایضاً،ص۷۔
۲۹۔ سید محمد اشرف، ’’ڈار سے بچھڑے‘‘، مشمولہ: نیا اردو افسانہ، مرتبہ، گوپی چند نارنگ، اردو اکادمی، دہلی ۱۹۸۸ء، ص۱۱۹۔
۳۰۔ ایضاً،ص۱۳۰۔
۳۱۔ ایضاً،ص۱۴۷۔
۳۲۔ ایضاً،ص۱۳۴۔
۳۳۔ ایضاً،ص۱۴۲۔
۳۴۔ امراؤ طارق، ’’بدن کا طواف‘‘، صبا پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص۱۱۶۔
۳۵۔ مہناز ضمیر، ’’امراؤ طارق: شخصیت اور فن‘‘، مکتبۂ جلیسانِ ادب، حیدر آباد، ۱۹۹۸ء، ص۲۹۔

۳۶ بدن کا طواف، محولہ بالا، ص ۱۳۶۔

۳۷ بدن کا طواف، محولہ بالا ص ۱۴۰۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

کتب:

۱۔ امراؤ طارق: ۱۹۸۱ء، ''بدن کا طواف''، صبا پبلی کیشنز، کراچی۔

۲۔ انتظار حسین: ۱۹۷۸ء، ''گلی کوچے افسانہ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔

۳۔ حیدر، قرۃ العین: سن ندارد، ''پت جھڑ کی آواز'' مکتبۂ اردو ادب،

۴۔ حیدر، قرۃ العین: ''سن ندارد، ''یاد کی ایک دھنک جلے''، رفعت پبلشرز، لاہور۔

۵۔ ضمیر، مہناز: ۱۹۹۸ء، ''امراؤ طارق: شخصیت اور فن'' مکتبۂ جلیسانِ ادب، حیدر آباد۔

۶۔ عابدی، خورشید زہرہ: ۱۹۸۷ء، ''ترقی پسند افسانے مع عورت کا تصور''، جے آر آفسیٹ پرنٹرز۔

۷۔ نارنگ، گوپی چند، مرتبہ: ۱۹۸۸ء، ''نیا اردو افسانہ''، اردو اکادمی، دہلی۔

رسائل:

۱۔ ماہ نامہ ''شب خون''، جون ۲۰۰۳، الہ آباد۔